سعید احمد رفیق

اقبال اور اہمیتِ اخلاق

کسی مفکر کے نظریات کو پوری طرح سمجھنے کے لیے یہ لازمی اور ضروری امر ہے کہ اس کی تعلیم و تربیت ماحول اور اس زمانہ کے عام حالات اور رجحانات کا تجزیہ کر لیا جائے۔ کیونکہ اس تجزیہ کے بغیر کسی مفکر کے نظریات کو بھی سمجھنا نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ ماحول اور شخصیت کی روشنی ہی میں اس کے خیالات کو سمجھا اور پرکھا جا سکتا ہے۔ اس لیے ڈاکٹر اقبال کے نظریات کو سمجھنے کے لیے انیسویں اور بیسویں صدی میں اس دنیا اور خاص طور پر عالم اسلام کی جو حالت تھی اس پر ایک طائرانہ نظر ڈال لینا بے جا نہ ہو گا۔

اٹھارویں صدی عیسوی میں یورپ صنعتی انقلاب سے روشناس ہو چکا تھا۔ جس کی وجہ سے مادی طور پر اس کی اکثر قوموں نے دنیا کی دوسری قوموں سے نسبتاً کافی ترقی کر لی تھی۔ ذہنی اور علمی طور پر بھی یورپ دوسرے براعظموں کو پیچھے چھوڑ چکا تھا۔ لیکن اس مادی اور ذہنی ترقی کا کوئی اعلیٰ مقصد نہ تھا۔ یورپ کی عیسائی قوموں نے عیسائیت کی عالمگیر تعلیم کو فراموش کر کے اپنے آپ کو قومیت اور وطنیت کے محدود دائروں میں مقید کر لیا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ انسانیت کو من حیث الکل آگے بڑھانے کی بجائے اس کی راہ میں سنگِ گراں ثابت ہو رہی تھیں۔ اٹھارویں صدی کے آخر میں فرانس نے نہایت اعلیٰ اصولوں کے تحت ملوکیت کا خاتمہ کیا۔ لیکن ان اصولوں کا جنازہ نپولین کے کاندھوں پر نکل گیا۔ اور نہ صرف یہ کہ فرانس کو ایک بدترین قسم کی ملوکیت کے زیر تحت آنا پڑا۔ بلکہ رجعتی طاقتوں نے انقلاب فرانس کو بہانہ بنا کر تمام یورپ کو سیاسی طور پر تنزل کی طرف لے جانے کی کوشش کی اور کچھ عرصہ تک میٹرنخ کی سرکردگی میں وہ کامیاب بھی رہیں۔ لیکن یورپ کی اکثر قوموں میں جذبہ قومیت پوری طرح جڑ پکڑ چکا تھا۔ بسمارک نے جرمنی کو متحد کر دیا۔ اور میزانی، گیری بالڈی اور کاؤنٹ کیور کی کوششوں نے اطالیہ کو ایک طاقت بنا دیا۔ انگلستان پہلے ہی ایک زبردست طاقت تھا۔ صنعتی انقلاب نے ان ممالک کو خام مال حاصل کرنے اور تیار شدہ مال کو فروخت کرنے کے لیے نوآبادیاں قائم

کرنے پر مجبور کیا۔ اس کے نتیجہ کے طور پر انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے نصف اول میں اکثر لڑائیاں ہوئیں۔ گذشتہ چالیس سالوں میں دنیا کو دو ایسی جنگوں سے واسطہ پڑ چکا ہے جو تباہی میں اپنی مثال آپ ہیں۔ قومیت اور وطنیت کی اس بڑھتی ہوئی آفت اور مصیبت سے بچنے کے لیے دنیا کے کچھ اعلیٰ دماغوں نے عالمگیر انسانیت کی تبلیغ شروع کی۔ گو تاحال انسانیت کی بنیاد پر کسی عالمگیر تنظیم کی بنیاد نہیں پڑ سکی ہے۔ بہر حال لیگ آف نیشنز اور یونائیٹڈ نیشنز اس کی طرف ایک معمولی سا قدم ضرور ہے۔ اشتراکیت کی تحریک نے قومیت پر ایک نئے زاویہ سے حملہ کیا اور مذہبی تحریکوں نے دوسرے رخ سے۔ قومیت اپنے بچاؤ کے لیے بدترین شکل فاشزم اور نازی ازم میں نمودار ہوئی۔ لیکن یورپ کی دوسری طاقتوں نے خود حفاظتی کے طور پر ان تحریکوں اور طاقتوں کو ختم کر دیا۔ تاہم وہ ابھی تک کسی ایسے نظام پر متفق نہیں ہو سکیں جو انسانیت کی اعلیٰ قدروں کا علمبردار ہو۔

یورپین اقوام کی چیرہ دستیوں نے ایشیا اور افریقہ کی قوموں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا تھا۔ زندہ رہنے کی جدوجہد کی بنا پر انیسویں صدی میں ان براعظموں میں متعدد تحریکیں شروع ہوئیں یہاں ہم صرف ممالک اسلامیہ کی ان تحریکوں کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں جنہوں نے دوررس نتائج پیدا کیے۔ اور مسلمانانِ عالم کو قعرِ مذلت سے نکالنے کی کوشش کی۔ یہ تحریکیں دو مختلف قسم کی تھیں۔ اولاً وہ جن کی بنیاد اسلام کے سیدھے سادے اور صاف اصول تھے اور جن کا مقصد اسلام کو اس کی اصل شکل میں دوبارہ زندہ کرنا تھا۔ اور دوسری وہ تحریکیں جو مغربی خیالات سے متاثر تھیں۔ اپنے آپ کو ظلم و ستم سے بچانے کے لیے اکثر ممالک نے قومیت کے دامن میں پناہ لی۔ اور ان ممالک میں جذبۂ قومیت کو فروغ ہونا شروع ہوا۔ تاکہ یورپ کے ظلم کا مقابلہ یورپ ہی کے ذہنی ہتھیاروں سے کیا جا سکے۔

اسلام کی نشاۃ ثانیہ تو حقیقتاً اٹھارویں صدی میں محمد بن عبدالوہاب اور شاہ ولی اللہ کی تحریکوں سے شروع ہو چکی تھی۔ لیکن ان کی رفتار اس قدر سست تھی۔ کہ انیسویں صدی کے نصف اول تک محدود علاقوں کے علاوہ ان کا کوئی خاص اثر نہ ہوا تھا۔ علاوہ ازیں ان دونوں تحریکوں کی بنیاد اسلام اور اس کے سادہ اصول تھے۔ یہ تحریکیں بنیادی طور پر مذہبی تھیں اور ریاست سے صرف بالواسطہ متعلق تھیں۔ اس کے برخلاف انیسویں صدی کے نصف آخر کی اکثر تحریکیں اولاً سیاسی تھیں اور ان کا اصل مقصد قومیت کے حربہ سے مغربی طاقتوں اور مطلق العنان حکمرانوں کے ظلم و ستم سے رہائی حاصل کرنا تھا۔

ترکی اپنے محل وقوع کی بنا پر مغربی خیالات سے سب سے پہلے متاثر ہوا۔ اٹھارویں صدی کے آخر

میں سلطان سلیم نے ایک طرف فوج کے نظام میں تبدیلی کر کے اسے بہتر بنانے کی کوشش کی اور دوسری طرف گورنروں کی مطلق العنانی کو ختم کرنے کے لیے قدم اٹھایا۔ بنا بریں فوج اور گورنر اس کے خلاف ہو گئے سلیم کے بعد محمود اور پھر عبدالمجید نے اصلاحات جاری رکھیں۔ لیکن عوام معاشی، اخلاقی اور تعلیمی طور پر اس قدر پست حالت میں تھے کہ ان اصلاحات کا خاطر خواہ نتیجہ نہ نکل سکا۔ لیکن قوم کی حالت کو سنوارنے میں یہ اصلاحات جو کام نہ کر سکیں وہ روس کے حملوں اور عبدالعزیز کے سخت اور رجعت پسندانہ رویہ نے کر دیا۔ سلطان عبدالعزیز اپنے پیش رووں سلیم، محمود اور عبدالمجید کے برخلاف قدامت پسند۔ کوتاہ نظر اور آرام پسند تھا۔ اس کے زمانہ میں مدحت پاشا کی زیر قیادت ایک قومی تحریک اٹھی، اور شناسی آفندی اور نامق بے نے ذہنی طور پر ترک قوم کو بیدار کرنے کی کوشش کی۔ اور علم و ادب میں ایک زبردست انقلاب کا موجب بنے۔ عبدالعزیز اور اس کے بعد عبدالحمید ثانی کے عہد میں عوامی تحریکوں کو کچلنے کی کوشش کی گئی۔ مدحت پاشا کو مکاری سے قتل کیا گیا۔ نامق بے قید و بند کی مصیبتیں جھیلتے جھیلتے آخر جلاوطنی کی موت مر گئے۔ نئے ادب پر پابندیاں لگائی گئیں۔ اعلےٰ طبقہ اور مذہبی پیشواؤں نے ہر ہر طریقہ سے ترقی کی مخالفت کی لیکن قومیت کا بے پناہ سیلاب ان تمام مخالفتوں کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے گیا۔ ۱۸۹۱ء میں "انجمن اتحاد ترقی" کی بنیاد ڈالی گئی۔ اس پارٹی کا اصل مقصد ترک قوم کو پوری طرح متحد کر کے داخلی اور خارجی آزادی حاصل کرنا تھا۔ چونکہ یہ ایک انقلاب پسند تحریک تھی اس لیے عبدالحمید ثانی نے اس کے جواب میں جمال الدین افغانی کی تحریک پان اسلام ازم کی صورت مسخ کر کے مسلمانان عالم کو اپنے گرد جمع کرنے کی کوشش کی لیکن ایک طرف نوجوان ترک اس پان اسلام ازم کے خلاف تھے۔ اور دوسری طرف انگریزوں نے عرب ممالک میں وطنیت اور قومیت کے جذبات بیدار کر کے اور جھوٹے سچے وعدوں سے انہیں ترکی کے خلاف بغاوت پر اکسایا۔ اور آخر کار جنگ عظیم اول کے بعد عرب ممالک عثمانی حکومت سے آزاد ہو گئے اور ترکی میں ایک ایسا انقلاب آیا جو زندگی کے ہر ہر پہلو پر زبردست طریقہ سے متاثر ہوا۔ اور اس نے ترکی کی کایا ہی پلٹ دی۔

اٹھارویں صدی کے اختتام پر نپولین کے مصر پر حملہ نے مصر کو مغربی خیالات سے روشناس کیا۔ فرانسیسیوں کی شکست کے بعد محمد علی نے مصر میں اصلاحات نافذ کیں اور ملک کو راہ ترقی پر گامزن کرنے کی کوشش کی لیکن اس کے جانشینوں نے اس کے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا۔ ادھر نہر سویز کی وجہ سے مغربی طاقتیں مصر کے معاملات میں زیادہ دلچسپی لینے لگیں۔ اسمٰعیل کی فضول خرچی نے انگریزوں کو مصر

پر قدم جمانے کا موقع دیا۔ عرابی پاشا نے اس کے خلاف آواز اٹھائی اور قومیت اور وطنیت کی بنیادوں پر آزادی کی تحریک شروع کی۔ لیکن انہیں ناکامی ہوئی۔ دوسری تحریک مصطفےٰ کامل کی سرکردگی میں اٹھی اور وہ بھی زیادہ کامیاب نہ ہو سکی۔ بہرحال مندرجہ بالا دونوں تحریکوں اور جمال الدین اور محمد عبدہٗ کی نیم مذہبی نیم سیاسی تحریک نے مصریوں کو خواب خرگوشی سے بیدار کر دیا تھا۔ اب سعد زغلول اور وفد پارٹی کے زیر قیادت مصریوں نے اپنی جدوجہد شروع کی اور مختلف نشیب و فراز سے گزرتے ہوئے بیسویں صدی کے وسط تک وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔

اٹھارویں صدی میں محمد بن عبدالوہاب کی مذہبی تحریک نے جزیرۃ العرب کے اکثر علاقوں میں کافی بیداری پیدا کر دی تھی۔ انیسویں صدی کے شروع میں محمد علی والی مصر نے اس تحریک کو کچھ عرصہ کے لیے دبا دیا۔ لیکن ایک جاگی ہوئی قوم کا جلد ہی سو جانا مشکل ہو جاتا ہے۔ بیسویں صدی کے شروع ہی سے اکثر عرب ممالک میں تحریک آزادی شروع ہوئی۔ اس سیاسی تحریک کی اصل وجہ قومیت کا وہی جذبہ تھا جس کی بنا وطنیت پر استوار ہے۔ یورپین طاقتوں نے عرب ممالک کے اس جذبہ کو ہوا دی۔ ان کا اصل مقصد ان ممالک کو ترکی سے آزاد کرا کر اپنے قبضہ میں لانا تھا تاکہ مشرق و مغرب کے اتصال کے یہ مراکز اور تیل کے اڈے ان کے ماتحت آ جائیں۔ یورپ میں ناکامی کے بعد ترک بادشاہوں نے اپنی توجہ عرب ممالک کو اپنے قبضہ میں محفوظ رکھنے کی طرف مبذول کر دی تھی۔ سلطان عبدالحمید اپنی حکومت کی لرزتی ہوئی عمارت کو مستحکم کرنے کی فکر میں تھے۔ لیکن انجمن اتحاد و ترقی کے اثر کے ماتحت ترک ان کے خلاف ہو چکے تھے۔ اس لیے وہ غیر ترکی مسلمانوں کی ہمدردی حاصل کرنے کی سوچنے لگے۔ اور پان اسلام ازم کی تحریک کو ہوا دی۔ ان کے مخالف انگریزوں نے اس کے جواب میں عرب ممالک میں قومی تحریک کے جراثیم پھیلانا شروع کر دیئے اور عرب جو عثمانی گورنروں کے ظلم سے عاجز آ چکے تھے ان کے جال میں پھنس گئے۔ دوسری طرف نوجوان ترک برسر اقتدار آ کر 'پان اسلام ازم' کے بجائے 'پان ترکی ازم' کے علمبردار بن گئے۔ جس کی بنیاد خالصاً قومیت پر تھی۔ اور اسی کا ردعمل تھا کہ عرب بھی اپنے آپ کو ایک قوم محسوس کرنے لگے۔ اور اپنے قومی وقار کو برقرار رکھنے کے لیے ترکوں کے چنگل سے نکلنے کی سوچنے لگے۔ اس طرح عرب قومیت کا بیج بویا گیا۔ ۱۹۰۵ء میں عرب قومی کانگرس نے اعلان کیا:

"ترک صرف رواج اور مذہب کے چھوٹے چھوٹے مسئلوں سے عربوں میں پھوٹ ڈال کر ان کو دبائے ہوئے ہیں۔ لیکن عربوں نے اپنے قومی، تاریخی اور نسلی اتحاد کا احساس دوبارہ پا لیا ہے

اور وہ اپنے آپ کو عثمانیوں کے گھن لگے ہوئے درخت سے الگ کرنا چاہتے ہیں۔ اور ایک آزاد حکومت کی شکل میں ایک ہونا چاہتے ہیں۔ یہ نیا عرب اپنے قدرتی حدود تک پھیلا ہوا ہوگا ...... یہ ایک عرب سلطان کے ماتحت ایک حریت پسند شاہی حکومت ہوگی ...... اس کا حکمران تمام مسلمانوں کا مذہبی خلیفہ ہوگا۔"[1]

جنگ عظیم اول کے بعد تمام عرب ممالک عثمانی حکومت سے آزاد ہوکر انگلستان یا فرانس کے قبضہ یا اقتدار میں چلے گئے۔ بہرحال اب وہ آہستہ آہستہ آزاد ہو چکے ہیں۔

نپولین کے عروج نے ایران کو بین الاقوامی اہمیت کا مالک بنا دیا تھا۔ وہ ایران کے راستہ ہندوستان پہنچنا چاہتا تھا۔ اس لیے انگریزوں نے وہاں اپنا اثر قائم کرنے کی کوشش کی۔ اور روس کی نگاہیں تو عرصہ سے شمالی ایران پر تھیں۔ فرانس تو جلد ہی میدان سے ہٹ گیا۔ بہرحال ایران کی اہمیت مسلم ہوگئی۔ تیل کی دریافت نے اس خطۂ زمین کو اور زیادہ اہم بنا دیا۔ شاہ ناصر الدین نے اپنے اخراجات کو پورا کرنے کے لیے مغربی حکومتوں سے قرض لیا۔ اور اس طرح انہیں اپنے قدم مضبوط کرنے کے مواقع بہم پہنچائے۔ ایک طرف ان اقوام کی لوٹ مار اور دوسری طرف باب ازم اور بہائی ازم اور اس کے بعد جمال الدین افغانی کی تحریک نے ایرانیوں میں قومیت کا جذبہ پیدا کیا اور بیسویں صدی میں باقاعدہ تحریک شروع کر دی گئی۔ کیا یہ تعجب کی بات نہیں کہ مذہبی طبقہ نے بھی اس تحریک میں قوم کا ساتھ دیا۔ آخر ایرانی پارلیمنٹ قائم کی گئی۔ اب پارلیمنٹ اور شاہ محمد علی میں جنگ شروع ہوئی۔ شاہ کے ساتھ روس اور برطانیہ کی طاقتیں تھیں اور پارلیمنٹ کے ساتھ قوم۔ آخر محمد علی کو اپنے گیارہ سالہ لڑکے احمد شاہ کے لیے تخت خالی کرنا پڑا۔ لیکن روس اور برطانیہ نے پارلیمنٹ کو کچھ نہ کرنے دیا۔ جنگ کے زمانہ میں روس اور برطانیہ یہاں کے سفید و سیاہ کے مالک تھے۔ لیکن آخر کار انقلاب روس نے روس کو ایران سے کافی بے تعلق کر دیا اور خود ایران میں قومی تحریک اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ جنگ کے بعد برطانیہ کچھ نہ کر سکا۔ جنگ عظیم کے بعد اس قومی تحریک کے علمبردار پہلے سید ضیاء الدین تھے اور پھر رضا خاں بنے۔ ملک جمہوریت کے لیے تیار نہ تھا۔ اس لیے مجلس نے ۱۹۲۵ء میں رضا شاہ کی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ اور اس طرح کچھ حد تک ایران کو آزادی نصیب ہوئی۔ مصطفےٰ کمال کی طرح رضا شاہ نے اپنے ملک کو مغربی لائنوں پر ترقی

---

[1] ممالک اسلامیہ کی سیاست از عشرت حسین صدیقی ص ۷۵، ۷۶

دینے کی جدوجہد شروع کی۔ اور کچھ حد تک انہیں اس میں کامیابی بھی ہوئی۔

برصغیر ہند و پاکستان سولھویں صدی ہی میں مغربی اقوام سے روشناس ہو چکا تھا۔ اٹھارویں صدی کے شروع تک شہنشاہان مغلیہ کی طاقت کے سامنے مغربی اقوام نے اپنے آپ کو صرف تجارت تک محدود رکھا۔ لیکن اس کے بعد ان میں سیاسی برتری حاصل کرنے کے لیے جدوجہد شروع ہوئی۔ اور آخر ایک صدی کے اندر اندر انگریزوں نے دوسری مغربی اقوام اور ہندوستانی طاقتوں کو کسی نہ کسی طرح شکست دے کر ہندوستان میں برتری حاصل کر لی۔ سلطان ٹیپو نے جان کی بازی لگا کر اس طاقت کو ختم کرنا چاہا۔ لیکن اپنوں کی ابن الوقتی نے اسے کامیاب نہ ہونے دیا۔ شاہ ولی اللہ نے نیم سیاسی نیم مذہبی تحریک شروع کی۔ سید احمد شہید اور شاہ اسمٰعیل شہید نے سکھوں اور انگریزوں کے خلاف تلوار اٹھائی۔ ۱۸۵۷ء میں پوری قوم نے انگریزوں کے خلاف جدوجہد کی۔ لیکن متعدد وجوہات کی بنا پر ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ ۱۸۵۷ء تک ہندوستان میں جو تحریکیں اٹھی تھیں وہ مغرب سے بالکل متاثر نہ تھیں۔ لیکن اس کے بعد کی تحریکیں بالواسطہ یا بلاواسطہ مغرب سے متاثر ہوئیں۔ سرسید کی تحریک مغربی اثرات کا نتیجہ تھی۔ سرسید کی تحریک کے ردعمل کے طور پر مذہبی قدامت پسندی نے اپنی جدوجہد میں تیزی اختیار کی۔ ان دونوں کا امتزاج ندوہ کی تحریک میں ہوا۔ شبلی کے زمانہ میں یہ تحریک آزاد خیالی کی راہ پر گامزن تھی۔ لیکن ان کی وفات کے بعد اس تحریک پر قدامت پسندی کا رنگ نسبتاً زیادہ چڑھ گیا۔ مذہبی تحریک جس کا مرکز دیوبند تھا مذہبی معاملات میں قدامت پسندی کے باوجود سیاسی طور پر قومیت اور وطنیت کے جذبات سے متاثر ہوئی۔ اور اس طرح مذہب میں قدامت پسندی اور سیاست میں انتہا پسندی اس کا مسلک بنا۔ یہ حالات تھے کہ ہندوستانی مسلمانوں میں قومیت کا جذبہ بیدار ہوا۔ لیکن بالکل نئی بنیادوں پر۔ وطن، نسل کی بجائے اس جذبہ کی بنیاد مذہب پر استوار تھی۔ اس جذبہ کی بنا پر پہلے خلافت کے لیے جدوجہد کی گئی۔ اور اس کے بعد مذہب اور تمدن کی بنا پر ایک آزاد وطن کا خواب دیکھا گیا۔ یہ خواب اگرچہ اقبال نے نہ دیکھا تھا۔ لیکن عوام میں اس کے لیے لگن پیدا کرنے میں اقبال کے فکر کا زبردست حصہ تھا۔

غرض ہم دیکھتے ہیں کہ اس زمانے میں عالم اسلام میں صرف بیداری کے آثار ہی پیدا نہ ہو چکے تھے بلکہ کچھ ممالک باقاعدہ ترقی کی راہ پر گامزن تھے۔ سیاسی طور پر عام طور سے وہ جذبۂ قومیت اور وطنیت سے متاثر تھے اور اس کا اثر اس قدر ہمہ گیر تھا کہ زندگی کے اکثر شعبوں میں مغرب کی تقلید کی جا رہی تھی۔ اس زمانہ میں جو اصلاحی تحریکیں اٹھیں وہ بھی مغرب سے متاثر تھیں۔ مذہبی تحریکوں پر بھی مغربی خیالات کا

اثر تھا۔ اور اسلامی اصولوں کو مغربی معیار سے پرکھنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ اس کے برخلاف بعض مذہبی تحریکوں نے نئے تقاضوں سے بالکل بے خبر نہایت سخت اور بے لچک اصولوں کو اپنا لیا تھا اور اس طرح موجودہ زمانہ کے عام رجحانات سے انہیں کوئی واسطہ تھا۔ سر سید احمد کی تحریک اگرچہ مغربی اثرات کا نتیجہ تھی لیکن اقبال کے الفاظ میں "سر سید احمد خاں کا اثر بحیثیت مجموعی ہندوستان ہی تک محدود رہا۔ غالباً یہ عصر جدید کے پہلے مسلمان تھے جنہوں نے آنے والے دور کی جھلک دیکھی تھی۔۔۔۔ سر سید احمد خاں کی حقیقی عظمت اس واقعہ پر مبنی ہے کہ یہ پہلے ہندوستانی مسلمان ہیں جنہوں نے اسلام کو جدید رنگ میں پیش کرنے کی ضرورت محسوس کی اور اس کے لیے سرگرم عمل ہو گئے۔"[1] لیکن سر سید اس اہم اور ضروری کام کو پوری طرح سر انجام نہ دے سکے۔ ان کے رفقاء کار نے اس کام کو جاری رکھا۔ لیکن اس اہم کام کو تکمیل تک پہنچانے کے لیے ایک ایسے مفکر اعظم کی ضرورت تھی جو ایک طرف مذہب اسلام کے اصولوں سے پوری طرح واقف ہو، اور دوسری طرف مغربی افکار، موجودہ سائنس کی معلومات اور انکشافات اور زمانہ حاضر کے رجحانات کو پوری طرح سمجھتا ہو۔ اور پھر اسے اس ضرورت کا بھی احساس ہو۔ اقبال اسلامی اصولوں کی اس تدوین کی ضرورت کو پوری طرح محسوس کرتے تھے۔ اس لیے انہوں نے مذہبی نظریات کو ایک نئے اور بہتر رنگ میں پیش کیا۔ اس انداز اور رنگ میں کہ وہ موجودہ زمانہ میں قابل قبول ہو سکیں۔

"عصر حاضر کا تقاضا یہ ہے کہ مذہبی حقائق کو سائنٹفک طریق پر پیش کیا جائے۔ اس لیے میں نے ان خطبات میں اسلامی مذہبی فلسفہ کو اس کی فلسفیانہ روایات اور علوم عصری کی روشنی میں از سر نو مدوّن کیا ہے۔ یہ دور اس کام کے لیے اس وجہ سے اور بھی موزوں ہے کہ طبیعیات (فزکس)، کے بنیادی اصولوں پر جو تنقید حکماء نے کی ہے اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ مادیت کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ اور وہ دن دور نہیں جب مذہب اور سائنس میں مطابقت کے نئے نئے پہلو ہمارے سامنے آجائیں گے۔"[2]

ان کے لحاظ سے "اسلام جدید تفکر اور تجربے کی روشنی میں قدم رکھ چکا ہے اور کوئی ولی یا پیغمبر بھی اس کو قرون وسطیٰ کے تصوف کی تاریکی کی طرف واپس نہیں لے جا سکتا۔"[3]

زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی وہ اس تدوین کی ضرورت کو محسوس کرتے تھے۔ "چونکہ ہمارے

---

(۱) حرف اقبال ص ۱۶۱ (۲) دیباچہ لکچرز (۳) حرف اقبال ص ۱۵۹

فقہا کو ایک عرصہ دراز سے عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ اور وہ عہد جدید کی داعیات سے بالکل بیگانہ ہیں۔ لہٰذا اس امر کی ضرورت ہے کہ ہم اس میں (نظام سیاست) از سر نو قوت پیدا کرنے کے لیے اس کی ترکیب و تعمیر کی طرف متوجہ ہوں[۱]۔ خلیل خالدی پروفیسر فلسفہ مسلم یونیورسٹی کو ادارہ دینیات کے متعلق مشورہ دیتے ہوئے رقمطراز ہیں "ادارۂ دینیات کو چاہیئے کہ دینیات کی ایک پروفیسر شپ قائم کرے جس پر کسی ایسے شخص کو متعین کیا جائے جس نے اسلامی دینیات اور جدید یورپین فکر و تصور کا مطالعہ کیا ہو۔ تاکہ وہ مسلم دینیات کو افکار جدید کا ہمدوش بنا سکے۔ قدیم اسلامی دینیات کے (جس کا ماخذ زیادہ تر یونانی حکمت و فکر تھا) تار و پود بکھر چکے ہیں۔ اب وقت آ چکا ہے کہ اس کی شیرازہ بندی کی جائے[۲]۔"

تعلیم و تربیت

اس مقصد عظیم کے لیے عالم اسلام کو جس مفکر اعظم کی ضرورت تھی وہ ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء مطابق ۲۴ ذی الحج ۱۲۸۹ھ بمقام سیالکوٹ پیدا ہوا۔ اقبال کے آباؤ اجداد کشمیر کے سپرو گوت برہمن تھے۔ اور تقریباً ڈھائی سو سال پہلے مشرف بہ اسلام ہو چکے تھے۔ اقبال نے بارہا اپنے اشعار میں اپنے برہمن زاد ہونے کا ذکر کیا ہے:

ہیں اصل نسب کا سومناتی — آبا مرے لاتی مناتی
تو سیّد ہاشمی کی اولاد — میری کف خاک برہمن زاد

میرد مرزا به سیاست دل و دیں باختہ اند — جز برہمن پسرے محرم اسرار کجاست؟

مرا بنگر کہ در ہندوستاں دیگر نمی بینی — برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است[۳]

قدیم ہندوستان کے برہمن غور و فکر اور علم و عقل میں آپ اپنی مثال تھے۔ اور اقبال کو یہ اعلیٰ دماغی صفات ورثہ میں ملی تھیں۔ ان صفات میں اسلامی روایات نے اقبال میں وسیع النظری، اخوت، محبت اور مساوات کو سمو دیا تھا۔ اس خاندان کو کشمیر سے آئے ہوئے ایک عرصہ گزر چکا تھا۔ لیکن اقبال کی رگوں میں جنت نشان

---

(۱) حرف اقبال ص ۲۱ (۲) اقبال نامہ دوم ص ۲۸۱ (۳) انور ص ۵

کشمیر کی رومانی فضا کا خون رواں تھا۔ اور اس خون میں سیالکوٹ کی آب و ہوا نے جوش و خروش بھی پیدا کر دیا تھا۔ اگر انسان کی زندگی میں وراثت اور آبائی ماحول کا کچھ اثر ہو سکتا ہے تو اقبال ان کے اچھے اثرات کے پوری طرح مالک تھے۔ ان خصوصیات کو ان کے ماحول اور تعلیم و تربیت نے اور چمکا دیا۔ ان کے والد شیخ نور محمد ایک تاجر تھے لیکن بڑے نیک، خدا ترس اور صوفی منش۔ پکے مسلمان تھے اور اسلام کے شیدائی۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ اقبال اپنی زندگی احکامات خداوندی کے مطابق بسر کریں۔ ایک مرتبہ انہوں نے اقبال کو نصیحت کی تھی کہ "بیٹا جب تم قرآن پڑھو۔ تو یہ سمجھو کہ قرآن تم ہی پر اترا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ خود تم سے ہم کلام ہے۔" ایک دفعہ اقبال نے غصہ میں کسی فقیر کو کچھ سخت سست کہا اور سزا بھی دی۔ ان کے والد کو جب اس واقعہ کا علم ہوا تو سخت افسوس ہوا۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور اقبال کو وہ نصیحت کی جسے وہ تمام عمر فراموش نہ کر سکے۔ اس نصیحت کو اقبال نے نہایت ہی پُر درد اور پر اثر انداز میں 'رموز بے خودی' میں "در معنیٔ این کہ حسن سیرت ملیہ از تادب محمدیہ است" کے عنوان کے تحت رقم فرمایا ہے:

اولاد کی تربیت میں جس ہستی کا سب سے زیادہ ہاتھ ہوتا ہے۔ وہ ماں ہے۔ اقبال کی والدہ بھی ایک دیندار اور نیک خصلت خاتون تھیں۔ انہوں نے اقبال کی تربیت کن اصولوں پر کی اور اقبال کو اس سے کیا حاصل ہوا۔ اس کا ذکر خود ڈاکٹر صاحب نے "والدہ مرحومہ کی یاد میں" کیا ہے۔

خاکِ مرقد پر تری لے کر یہ فریاد آؤں گا　　اب دعائے نیم شب میں کس کو میں یاد آؤں گا
تربیت سے تیری میں انجم کا ہم قسمت ہوا　　گھر مرے اجداد کا سرمایۂ عزت ہوا
دفتر ہستی میں تھی زریں ورق تیری حیات　　تھی سراپا دین و دنیا کا سبق تیری حیات

غرض اقبال کی تربیت نہایت اعلیٰ اخلاقی اور مذہبی اصولوں پر ہوئی۔ اقبال کی تمام زندگی میں یہ رنگ نہ صرف قائم رہا بلکہ غالب رہا اور اس اعلیٰ تربیت نے اقبال کی پوری زندگی کو ایک خاص رنگ میں رنگ دیا۔

اقبال کی ابتدائی تعلیم ایک مکتب سے شروع ہوئی۔ مکتب کے بعد وہ ایک پرائمری اسکول میں داخل ہوئے۔ پرائمری اور مڈل کے امتحانات میں وظیفہ حاصل کر کے انٹرنس میں پہنچے۔ اور وہاں بھی وظیفہ حاصل کیا۔ اسی زمانہ میں یہ مشن اسکول اسکاچ مشن کالج بن گیا۔ اور اقبال نے اپنی تعلیم یہیں جاری رکھی۔ اس اسکول اور کالج میں اقبال کو ایک استاد میسر آیا جس نے اقبال کی تعلیم و تربیت میں پوری دلچسپی کا اظہار کیا۔

یہ استاد مولانا میر حسن تھے جو بعد میں شمس العلما بنے۔ صاحب موصوف نے ایک طرف اقبال کے دل کو اسلام کی محبت سے لبریز کیا اور دوسری طرف اقبال کو علم و ادب کا دلدادہ بنایا۔ اقبال اپنے استاد کی خدمت میں ہدیۂ خراج پیش کرتے ہوئے "التجائے مسافر" میں فرماتے ہیں:

وہ شمع بارگہ خاندان مرتضوی — رہے گا مثلِ حرم جس کا آستاں مجھ کو
نفس سے جس کے کھلی میری آرزو کی کلی — بنایا جس کی مروت نے نکتہ داں مجھ کو
دعا یہ ہے کہ خداوندِ آسمان و زمیں — کرے پھر اس کی زیارت سے شادماں مجھ کو

مشن کالج سیالکوٹ کے بعد اقبال گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوئے۔ خوش قسمتی سے یہاں بھی انہیں ایک قابل اور مہربان استاد مل گیا۔ فلسفہ کے پروفیسر آرنلڈ جو بعد میں سر ہوئے۔ ایم۔ اے۔ او کالج علیگڈھ سے گورنمنٹ کالج لاہور آ گئے تھے۔ مستشرقین میں ان کا رتبہ کافی بلند ہے۔ بی۔ اے اور ایم۔ اے میں ڈاکٹر اقبال کا مضمون فلسفہ تھا۔ آرنلڈ استاد اور اقبال شاگرد۔ پروفیسر آرنلڈ نے اقبال کے شوق کو اور بڑھایا۔ اقبال نے بی۔ اے اور ایم۔ اے ہر دو جماعتوں میں نمایاں کامیابی حاصل کر کے متعدد تمغات حاصل کیے۔ جس طرح مولانا میر حسن نے اقبال میں ادب اور شعر و شاعری کے شوق کو چمکایا۔ اسی طرح پروفیسر آرنلڈ نے ان میں فلسفہ کا صحیح ذوق پیدا کیا۔ ان کے جوہر ذاتی پر جلا کی۔ اور ایک خاص مدرسۂ فکر کو اپنانے میں مدد کی۔ اقبال کو آرنلڈ سے جو محبت اور عقیدت تھی وہ "بانگ درا" کی نظم "نالۂ فراق" اور "فلسفہ عجم" کے انتساب سے ظاہر ہے۔

ایم۔ اے کے بعد اقبال نے کچھ عرصہ اورینٹل کالج لاہور اور پھر بعد میں گورنمنٹ کالج لاہور میں اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے کام کیا۔ لیکن آرنلڈ کی محبت اور علم کے شوق نے انہیں ۱۹۰۵ء میں انگلستان پہنچا دیا۔ ملک راج آنند کے الفاظ میں "خوش قسمتی سے انگلستان میں پہنچتے ہی ان کی ملاقات میک ٹیگرٹ جیسے فلسفی سے ہوئی جو ہیگل کا متبع تھا۔ اور اس زمانہ میں فلسفی کی حیثیت سے بے حد شہرت حاصل کر چکا تھا۔ پھر ادب فارسی کے مشہور مؤرخ اے۔ جی براؤن اور "اسرار خودی" کے مترجم ڈاکٹر نکلسن سے ملاقات ہوئی۔ عنفوان زندگی میں ڈاکٹر صاحب کو فلسفہ اور ادب فارسی سے بے حد شغف تھا۔ لیکن جب ان کا رجحان وطنیت اور قومیت کی طرف ہوا اور وہ ان موضوعوں پر نظمیں لکھنے لگے۔ تو یہ شوق دب کر رہ گیا۔ اب یہ شوق پھر پیدا ہوا۔ اور ان لوگوں کے اثر و تربیت نے اسے پختہ کر دیا۔ میک ٹیگرٹ کے لکچروں سے انہوں نے فلسفیانہ خیالات کا سائنٹیفک انداز سیکھا۔ . . . . . براؤن اور نکلسن کی دوستی

سے انہیں یہ فائدہ ہوا کہ انہوں نے گھر پر فارسی کا جو علم حاصل کیا تھا۔ اس میں پختگی پیدا ہو گئی۔"(۱)

ڈاکٹر اقبال نے تین سال تک یورپ میں قیام فرمایا۔ اور وہاں سے متعدد ڈگریاں لے کر ۱۹۰۸ء میں ہندوستان واپس تشریف لائے۔ ان ڈگریوں میں بیرسٹری، کیمبرج یونیورسٹی سے فلسفۂ اخلاق کی اعلیٰ ڈگری۔ اور میونچ یونیورسٹی جرمنی سے ایرانی الٰہیات پر پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ آپ چھ ماہ تک لندن یونیورسٹی میں پروفیسر آرنلڈ کے قائم مقام کی حیثیت سے عربی کے پروفیسر بھی رہے۔ یورپ کے قیام نے اقبال کو ذہنی طور پر بہت فائدہ پہنچایا۔ انہوں نے وہاں وطنیت اور قومیت کی تباہ کاریاں دیکھیں جنہوں نے یورپ کو بربادی کی اس راہ پر ڈال دیا تھا جہاں سے واپس ہونا آسان نہیں۔ لاہور کے زمانۂ قیام میں اقبال وطنیت اور قومیت کے زبردست شیدائی تھے۔ "بانگ درا" کے حصۂ اول کی اکثر نظمیں اس کی شاہد ہیں۔ لیکن جب یورپ میں انہیں ان نظریات کی تباہ کاریوں کا بلا واسطہ مشاہدہ کرنے کا موقع ملا۔ تو انہوں نے ان نظریات پر غور و خوض کیا اور آخر کار اس محدود نظریہ قومیت کو چھوڑ کر عالمگیر اخوت کے اس نظریہ کو اپنایا جس کی تعلیم اسلام نے دی ہے۔ لیکن اقبال اہل یورپ کی زندگی کے عملی پہلو سے کافی متاثر ہوئے عمل عمل۔ ہر وقت عمل۔ جد و جہد۔ جیسے وہ آرام کرنا جانتے ہی نہیں۔ انہیں اس مختصر زندگی میں آرام کرنے کی فرصت ہی نہیں۔ مگر ان کی جد و جہد صرف مادی زندگی کی مادی ضروریات کی تکمیل تک محدود ہے اقبال کے خیال میں جد و جہد کو صرف مادی ضروریات تک محدود کر لینا مناسب نہ تھا۔ وہ روحانی ترقی اور اس کے لیے جد و جہد کو لازمی اور ضروری سمجھتے تھے۔ بہر حال عمل کسی صورت میں بھی ہو ان کی نگاہ میں مستحسن تھا۔ ہندوستان واپس تشریف لا کر اقبال نے ڈیڑھ سال تک گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ کے پروفیسر کی حیثیت سے کام کیا اور اس کے ساتھ ساتھ بیرسٹری بھی کرتے رہے۔ لیکن اس کے بعد پروفیسری سے مستعفی ہو کر ذریعۂ معاش کے لیے صرف بیرسٹری کو منتخب فرمایا۔ لیکن چونکہ آپ کی اصل توجہ علمی، ادبی اور بعد میں قومی معاملات کی طرف مبذول رہتی تھی اس لیے آپ کو اس پیشہ میں کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔

اگرچہ اقبال وطنیت اور قومیت کے نظریات کو یورپ کے زمانہ قیام ہی میں غلط سمجھنے لگے تھے لیکن بعد کے واقعات نے تو انہیں ان نظریات سے متنفر سا کر دیا۔ جنگ بلقان، جنگِ عظیم اول اور

---

(۱) نیرنگ خیال۔ اکتوبر ۱۹۳۲ء

جنگ عظیم کے بعد فاتح اقوام کا مفتوح اقوام اور ان کے علاوہ ایشیا اور افریقہ کے مختلف ممالک سے برتاؤ نے اقبال کے دل و دماغ پر زبردست اثر کیا۔ ممالک اسلامیہ کی تباہ حالی ان کے سامنے تھی۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ یہ سادہ لوح مسلمان مذہبی طور پر تو پہلے ہی سے تقلید اور تصوف کے ذہنی امراض میں مبتلا تھے۔ اب سیاسی طور پر وطنیت اور قومیت کے پھندوں میں گرفتار ہو گئے۔ مغربی خیالات سے متاثر نوجوان، ملا کے مذہب سے بیزار تھے۔ اور چونکہ ملائیت اور اسلام کو ایک ہی چیز سمجھ لیا گیا تھا اس لیے ان کی یہ بیزاری صرف ملائیت تک محدود نہ تھی بلکہ اس نے اپنی لپیٹ میں اسلام کے اعلیٰ اصولوں کو بھی لے لیا تھا۔ انیسویں صدی میں مادی اور طبیعیاتی علوم کی ترقی نے مذہب کے خلاف ایک عام رویہ پیدا کر دیا تھا۔ مذہبی رہنماؤں نے مذہب کو صرف ان جامد اصولوں تک محدود کر رکھا تھا جو زمانہ انحطاط کی پیداوار تھے۔ اور یہ رہنما ان اصولوں میں کسی قسم کی بھی تبدیلی کو روا نہ رکھتے تھے۔ اقبال نے ان جامد اصولوں، تقلید، تصوف، تقدیر کے خلاف آواز اٹھائی۔ اور مذہب کو موجودہ علوم کی روشنی میں پیش کیا اور تمام نوع انسان کو انسانیت کا پیغام دیا۔ یہ پیغام کسی ایک فرقہ، مذہب، قوم یا ملک کے لیے نہیں تھا بلکہ تمام انسانوں کے لیے۔ اگرچہ ان کا بلا واسطہ خطاب مسلمانوں سے تھا کیونکہ وہ اسلام کو معیارِ انسانیت سمجھتے تھے۔

اقبال ایک مفکر

اقبال پہلے ایک مفکر اور فلسفی تھے یا ایک شاعر؟ یہ ایک ایسا سوال ہے کہ اگرچہ اقبال نے اس کے متعلق خود بارہا اپنے خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔ لیکن اس پر بجا طور سے دو رائیں ہو سکتی ہیں اور ہیں۔ مولانا عبدالسلام ندوی کو شکایت ہے کہ "ڈاکٹر صاحب پر جو کچھ لکھا گیا ہے۔ اس میں ان کی شاعرانہ حیثیت کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اور انہوں نے جن حقائق و مسائل کے متعلق اپنے خیالات ظاہر کیے ہیں۔ ان کی توضیح کے لیے جو مثالیں ان کے کلام سے پیش کی گئی ہیں۔ ان میں شاعری بہت کم پائی جاتی ہے۔" ایک اور مقام پر رقمطراز ہیں "ڈاکٹر صاحب کی اصلی حیثیت صرف شاعر کی ہے۔ فلسفی کی نہیں۔ لیکن افسوس اور افسوس کے ساتھ تعجب ہے کہ لوگوں نے ان کی شاعرانہ حیثیت کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے اور ان کو دنیا کے سامنے صرف ایک فلسفی۔ ایک مجدد اور ایک سیاست دان

---

(۱) ندوی۔ دیباچہ۔ ص ۳-۴

کی حیثیت سے پیش کیا ہے[۱]۔" قاضی عبدالحمید صاحب فرماتے ہیں" اقبال ایک شاعر تھا اور شاعری اس کے لیے جزو پیغمبری تھی۔ اور اس نے جو کچھ حاصل کیا تھا وہ سرچشمۂ حقیقت سے بلا واسطہ تعلق کا نتیجہ تھا۔ وہ صرف عقل کا ممنون احسان نہ تھا۔ بلکہ اپنی تمام وجدانی کیفیت کا۔ اس بنا پر اس کے خیالات کو ہم محدود معنی میں فلسفہ نہیں کہہ سکتے۔ بلکہ وہ ایک مکمل تصور کائنات تھا جس کو شاعری کا رنگ و روپ دے کر اقبال نے دنیا کے سامنے پیش کیا۔ ہر بڑے شاعر کے لیے ایک تصور کائنات کا ہونا لازمی امر ہے۔ اسی طرح اقبال کا بھی ایک تصور کائنات تھا۔ جو لوگ اقبال کے کلام اور زندگی کو بحیثیت ایک شاعر کے سمجھنے کی کوشش کریں گے وہ اسے صحیح سمجھیں گے۔ لیکن جو لوگ اسے بحیثیت ایک فلسفی یا سیاست دان کے سمجھنے کی کوشش کریں گے ان کے لیے اقبال کا کلام اور اس سے زیادہ اس کی زندگی ایک عقدۂ لاینحل ہو کر رہ جائے گی۔ اقبال از اول تا آخر ایک شاعر تھا[۲]۔" اسی طرح مجنوں گورکھپوری لکھتے ہیں "اقبال کے فلسفیانہ میلانات اور ان کے پیغام میں ہم کچھ اس طرح محو ہو جاتے ہیں کہ ان کی ایک حیثیت کو جو سب سے زیادہ مستقل اور ممتاز ہے بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ہم بھول جاتے ہیں کہ اقبال کی پہلی اور آخری حیثیت شاعر کی ہے[۳]۔"

لیکن اقبال کو پہلے شاعر یا صرف شاعر مان لینا یک طرفہ رائے ہے۔ خود ڈاکٹر اقبال اس کے متعلق فرماتے ہیں: "شاعری میں لٹریچر بحیثیت لٹریچر کے کبھی میرا مطمح نظر نہیں رہا۔ کہ فن کی باریکیوں کی طرف توجہ کرنے کے لیے وقت نہیں۔ مقصود صرف یہ ہے کہ خیالات میں انقلاب پیدا ہو اور بس۔ اس بات کو مدنظر رکھ کر جن خیالات کو مفید سمجھتا ہوں ان کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہوں[۴]۔"

مولانا سید سلیمان ندوی ہی کو ایک اور خط میں تحریر فرماتے ہیں:

" فن شاعری سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ ہاں بعض مقاصد خاص عزیز رکھتا ہوں جن کے بیان کے لیے اس ملک کے حالات و روایات کی رو سے میں نے نظم کا طریقہ اختیار کر لیا ہے۔ ورنہ

نہ بینی خیر ازاں مرد فرو دست   کہ بر من تہمت شعر و سخن بست[۵]"

بلکہ انہوں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ "حقیقت میں میں نے جو کچھ لکھا ہے۔ اس کی نسبت دنیائے شاعری سے کچھ بھی نہیں اور نہ کبھی میں نے SERIOUSLY اس طرف توجہ کی ہے[۶]۔"

---

(۱) ندوی ص ۱۸۵   (۲) رسالہ اردو اقبال نمبر، طبع جدید ص ۲۰۵   (۳) بحوالہ ندوی ص ۱۸۵

(۴) اقبال نامہ اول ص ۱۰۸   (۵) اقبال نامہ اول ص ۱۹۵   (۶) اقبال نامہ اول ص ۲۷۴

"یہ ہندی فارسی ہے ایک ایرانی کو کیا پسند آئے گی۔ میرے زیر نظر حقائق اخلاقی وملی ہیں۔ زبان میرے لیے ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔ بلکہ فن شعر سے بھی میں بحیثیت فن کے نابلد ہوں۔"

غرض اقبال نے اپنے خطوط میں اس بات کی وضاحت کر دی ہے کہ ان کا اصل مقصد شاعری نہیں وہ تو یہ بھی نہ چاہتے تھے کہ ان کا شمار اس زمانہ کے شعرا میں ہو" میرا ادبی نصب العین نقاد کے ادبی نصب العین سے مختلف ہے۔ میرے کلام میں شعریت ایک ثانوی حیثیت رکھتی ہے اور میری ہرگز یہ خواہش نہیں کہ اس زمانے کے شعرا میں میرا شمار ہو[1]۔" "آپ کو معلوم ہے کہ میں اپنے آپ کو شاعر تصور نہیں کرتا اور نہ کبھی بحیثیت فن کے میں نے اس کا مطالعہ کیا ہے۔ پھر میرا کیا حق ہے کہ صف شعرا میں بیٹھوں[2]" اقبال نے بارہا اپنے اشعار میں بھی اس چیز کو واضح کیا ہے:

مری نوا میں نہیں ہے ادائے محبوبی ۔۔۔ کہ بانگ صور سرافیل دل نواز نہیں

حدیث بادہ و مینا و جام آتی نہیں مجھ کو ۔۔۔ نہ کر خاراشگافوں سے تقاضہ شیشہ بازی کا

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ ۔۔۔ کہ میں ہوں محرم راز درون مے خانہ

نہ شیخ شہر نہ شاعر نہ خرقہ پوش اقبال ۔۔۔ فقیر راہ نشین ست و دل غنی دارد

شاعری زیں مثنوی مقصود نیست ۔۔۔ بت پرستی، بت گری مقصود نیست

حسن انداز بیاں از من مجو ۔۔۔ خوانسار و اصفہاں از من مجو

بہادر یار جنگ کہتے ہیں "بعض اوقات ایک سوال اٹھایا جاتا ہے کہ اقبال سب سے پہلے شاعر تھے یا فلسفی۔ ایک انسان کا فلسفہ بہ حیثیت انسان کے اس کی حقیقت کو بے نقاب کرتا ہے۔ شاعری

---

(۱) اقبال نامہ دوم ص ۲۵۴ ۔۔۔ (۲) اقبال نامہ دوم ص ۳۶۷

صرف ایک ادائے بیان ہے۔ ایک مفکر کی حیثیت سے فلسفیانہ موضوع پر اقبال کے نظریات ان کی عمر کی ترقی کے ساتھ ساتھ رواں رہے۔ . . . . ان کی شاعری ان کے خیالات کی صرف زبان ہے ہمیشہ پہلے آدمی آتا ہے اس کے بعد اس کی زبان آتی ہے۔ اس نقطۂ نظر سے وہ شاعر سے زیادہ فلسفی تھے"[۱]

سر ڈینی سن راس کے خیال میں " انہوں نے اپنے خیالات کے اظہار کے لیے اپنی شاعرانہ صلاحیتوں سے کام لیا۔ لیکن انہوں نے محسوس کیا کہ عوام تک پہنچنے کے لیے انہیں کلاسیکل فارسی شاعری مع اس کی تمام روایات اور تشبیہات کے معیار پر پورا اترنا چاہیئے۔ میں اکثر یہ سوچتا تھا۔ کہ اپنے خیالات کو ظاہر کرنے کا یہ طریقہ مناسب ہے جو انہوں نے اپنے لیے منتخب کیا ہے۔ کیونکہ اعلیٰ فارسی شاعری بذاتِ خود ایک مقصد بن جاتی ہے۔ اور قاری کو عملی طور پر متاثر نہیں کرتی۔ بہر حال ۱۹۳۲ء میں انہوں نے اپنے خطبات شائع کرائے۔ جن میں انہوں نے اسلام کو مرکز بنا کر ایک بہتر نظام عالم قائم کرنے کے لیے اپنے نظریات اور مقاصد پیش کیے۔ اور غالباً وہ ان خطبات ہی کی بنا پر زیادہ بہتر طریقہ سے یاد رکھے جائیں گے"[۲]۔

پروفیسر ایم۔ ایم شریف اقبال کی ان دونوں حیثیتوں میں توازن قائم رکھتے ہوئے فرماتے ہیں " ان میں فلسفہ اور شاعری کا ایک ایسا حسین امتزاج تھا جو ان سے پہلے کسی بھی بڑے مفکر یہاں تک کہ دانتے میں بھی نہیں ملتا۔ ان کی شاعری اور ان کا فلسفہ دونوں عظیم ہیں۔ غالباً ان کی شاعری کی عظمت ان کے فلسفہ میں اور ان کے فلسفہ کی عظمت ان کی شاعری میں پوشیدہ ہے۔ ان کے ذہنی ارتقا میں دونوں کا برابر حصہ ہے۔ اور کوئی بھی کسی سے پیچھے نہیں۔ ان کی تمام زندگی میں ان دونوں میں نہ صرف توازن قائم رہا بلکہ ان کی زندگی ان کا بہترین امتزاج ہے"[۳]۔

اس میں تو کوئی شک ہی نہیں کہ " اقبال کی شاعرانہ شخصیت میں .... ایسی عظمت ، رفعت ، گہرائی۔ ایسا متحرک جمال ۔ ایسا حسین جلال ہے کہ نا ممکن ہے کوئی ان کا اور پھر دنیا بھر کے ادب کا نیک نیتی سے مطالعہ کرے اور پھر اقبال کو دنیا کے شاعروں کی اول ترین صف میں شمار نہ کرے۔ وہ صف جس میں صدیوں کے بعد کسی شاعر کو جگہ ملتی ہے۔ اور وہ صف جس میں ہومر ، شیکسپیئر دانتے ، کالیداس اور گوئٹے شامل ہیں"[۴]۔

---

(۱) بحوالہ آذری ص ۲۹۴ (۲) رسالہ اردو اقبال نمبر طبع جدید ص ۱۴ (۳) IQBAL AS A THINKER PAGE 186 (۴) عزیز احمد ص ۵۹۲ ۔ ۵۹۳

لیکن اگر ہم اقبال شاعر اور اقبال فلسفی کا مقابلہ کریں تو اقبال شاعر کو شاعروں کی اول ترین صف میں شمار کرنے کے باوجود اقبال فلسفی کو اقبال شاعر سے بلند تر درجہ دینا پڑتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اقبال بحیثیت شاعر کے بلند ترین مقام پر نہیں۔ وہ شاعروں کی صف اول میں ہیں لیکن فلسفہ میں ان کا مقام اس سے بھی بلند ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال ایک زبردست شاعر ہونے کے باوجود صرف شاعر نہ تھے بلکہ برنگ اعجاز شاعرانہ ایک پیغامبر۔ ایک مفکر اور ایک کلیم بھی۔ ان کی شاعرانہ عظمت سے انکار ممکن نہیں۔ لیکن شاعری ان کا اصل مقصد نہ تھا۔ بلکہ کسی اعلیٰ تر مقصد کو حاصل کرنے کا صرف ایک ذریعہ۔ انہوں نے بعض خاص مقاصد کے بیان کے لیے اس ملک کے حالات اور روایات کی رو سے نظم کا طریقہ اختیار کیا۔ وہ یہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ایک شعر دل و دماغ پر جس طرح اثر انداز ہوتا ہے، نثر کا ایک جملہ اس سے محروم ہے۔ ابن تیمیہ نے مسئلہ وحدت الوجود کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ گو ابن تیمیہ کی زبردست منطق نے کچھ نہ کچھ اثر ضرور کیا ہے مگر حق یہ ہے کہ منطق کی خشکی شعر کی دلربائی کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔" اور اسی بنا پر "میں نے اس دقیق مسئلے کو فلسفیانہ دلائل کی پیچیدگیوں سے آزاد کر کے تخیل کے رنگ میں رنگین کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ اس کی حقیقت کو سمجھنے اور غور کرنے میں آسانی پیدا ہو۔"[1]

نہ صرف یہ دقیق مسئلہ بلکہ اقبال نے اپنے اکثر خیالات نظم ہی میں پیش کیے ہیں۔ تاثر پذیری تو یقیناً نظم کا حصہ ہے لیکن وضاحت نثر کا۔ فلسفہ کا طالب علم جس قدر غالباً ان کے لیکچرز تھیسس۔ بیانات۔ خطوط سے مستفید ہو سکتا ہے۔ شاید اس قدر ان کی نظموں سے نہیں۔ شاعری کو اظہار بیان بنانے کا یہ فائدہ تو ضرور ہوا کہ اقبال کے بعض خیالات بہت جلد مقبول ہو گئے۔ لیکن چند اور نقصانات کے علاوہ ایک زبردست نقصان یہ بھی ہوا کہ ہم ان کے تمام خیالات سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔ ان کے اکثر نظریات اور خیالات ان کے مختلف اشعار میں منتشر ہیں۔ زندگی کے بعض پہلوؤں کے متعلق اقبال کے نظریات میں ہم اس طرح کھو گئے کہ کبھی یہ خیال بھی نہیں کرتے کہ اقبال نے دوسرے علمی اور عملی مسائل پر بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور خامی یہ پیدا ہو گئی کہ اقبال کے بعض خیالات پر جداگانہ بہت بہت کام ہوا لیکن انہیں ایک لڑی میں پرونے کی کوئی خاص کوشش نہیں کی گئی۔ اقبال کے نظریۂ خودی پر غالباً سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے لیکن ان کے عام نظریۂ اخلاق میں

---

(۱) دیباچہ اسرار خودی اشاعت اول (۲)

ان کے نظریۂ خودی کی جو جگہ ہے اسے اس رنگ میں مرتب اور منظم نہیں کیا گیا ہے جس کی وہ مستحق ہے۔ اس موجودہ کتاب کا مقصد ان کے نظریۂ اخلاق کا اجمالی جائزہ اور خودی کی حیثیت کا تعین ہے۔

کسی مفکر کے افکار اور نظریات کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم اس کے ایک ایک نظریہ پر جداگانہ حیثیت سے نظر ڈالنے کے علاوہ اس کے تمام نظریات اور افکار کا بحیثیت مجموعی بھی مطالعہ کریں۔ ایک نظریہ کو دوسرے نظریات کی روشنی میں سمجھیں۔ اور ان تمام خیالات و افکار کو ایک منظم اور مربوط شکل دینے کی کوشش کریں۔ بصورت دیگر ان نظریات میں ہمیں کہیں ابہام نظر آئے گا اور کہیں تضاد۔ یہ بالکل دوسری بات ہے کہ کسی شخص کو اس کے پورے نظام فکر سے اختلاف ہو۔ بہرحال منطقی طور پر یہ ناممکن ہے کہ ایک منظم اور مربوط نظام فکر کے صرف کچھ اجزا قابل قبول ہوں۔ اور دوسرے شرف قبولیت سے محروم۔ ایک مربوط نظام فکر ایک ایسی عمارت ہے کہ اس کی کسی ایک اینٹ کو بھی اس کی جگہ سے نہیں ہٹایا جا سکتا۔ ہٹانا تو درکنار جنبش بھی نہیں دی جا سکتی۔ اور اگر ایسا کرنے کی ناکام کوشش کی جائے تو وہ تمام عمارت ملبہ کا ایک ڈھیر بن کر رہ جاتی ہے۔

اقبال نے زندگی کے علمی اور عملی اکثر پہلوؤں پر ایک خاص نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی ہے۔ ان کا ایک خاص مقصد ہے۔ ایک خاص زاویہ نگاہ ہے۔ وہ ایک خاص مدرسۂ فکر کے حامی اور پیرو ہیں۔ ان کے تمام خیالات اور نظریات اس خاص زاویہ کے مطابق ہیں۔ انہوں نے مابعد الطبیعیاتی، مذہبی، سیاسی، علمی، اخلاقی، تمدنی، تعلیمی، فنی، معاشی، غرض اکثر مسائل پر اپنے خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔ عملی طور پر سمجھنے کے لیے ہم ان تمام نظریات کا الگ الگ مطالعہ کر سکتے ہیں اور کرنا چاہیئے۔ لیکن اس کے باوجود اس بنیادی چیز کو فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ یہ ایک تسبیح کے مختلف دانے ہیں اور ایک دوسرے سے متعلق۔ اگر ہم اقبال کو حقیقتاً سمجھنا چاہتے ہیں تو ان تمام نظریات کا ایک دوسرے کی روشنی میں مطالعہ کرنا چاہیئے اور صرف اس وقت ہم اس کے مکمل نظام فکر کو سمجھ سکتے ہیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے یہ ضروری ہے کہ ان کے بنیادی نقطۂ نظر کو سامنے رکھتے ہوئے مختلف نظریات کا مطالعہ کیا جائے۔ اسی مقصد کے پیش نظر آئندہ صفحات میں ان کا نظام اخلاق پیش کیا جا رہا ہے۔ تاکہ ہم دیکھ سکیں کہ اقبال کے نظام فکر میں اخلاق کو کیا جگہ حاصل ہے۔ کیا وہ کسی خاص مدرسۂ فکر کے پیرو ہیں۔ اور اگر ہیں تو کیا انہوں نے کسی دوسرے کے یا دوسروں کے خیالات کو اپنے الفاظ میں پیش کر دیا ہے۔ یا ایک خاص مدرسۂ فکر کے حامی ہونے کے باوجود انہوں نے اس نظریہ کو بہتر الفاظ میں اور وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ کیا اس میں کچھ ترمیم و

تنسیخ کی ہے اور دوسرے مفکرین سے متاثر ہونے کے باوجود ان کا نظریہ دوسروں سے کچھ مختلف ہے۔ اور اگر مختلف ہے تو کیا بہتر ہے یا اس کے برخلاف۔ علاوہ ازیں اقبال کے نظریۂ اخلاق کے مطالعہ سے شاید اقبال کے نظام فکر کو بحیثیت مجموعی سمجھنے میں کچھ مدد مل سکے۔

اقبال نے انسان کو ایک خاص زندگی کا پیغام دیا ہے۔ ان سے بہتر اس چیز کو اور کون جان سکتا تھا کہ انسانی زندگی میں انفرادی اور اجتماعی طور پر اخلاق کو جو جگہ حاصل ہے وہ ایک ایسی جگہ ہے کہ اس سے بہتر جگہ کسی اور چیز کے حصہ میں آہی نہیں سکتی۔ ہر قوم، ہر مذہب، ہر زمانہ میں اخلاق پر زور دیا گیا ہے۔ روحانی۔ دماغی۔ مادی۔ غرض کسی قسم کی ترقی بھی بغیر اعلیٰ اخلاق کے ممکن نہیں۔ ترقی کی عمارت جن بنیادوں پر استوار ہے ان میں سے ایک اخلاق ہے۔ ترقی کے دوسرے عناصر اور اخلاق میں عمل اور رد عمل کا تعلق ہے۔ دوسرے عناصر اخلاق کو آگے بڑھاتے ہیں اور اخلاق دوسرے عناصر کو، اور اس طرح انسانیت شاہراہ ترقی پر گامزن رہتی ہے۔ اخلاق کی اہمیت کے پیش نظر اقبال نے اپنی مختلف تحریروں اور اشعار میں اس پر بہت کافی زور دیا ہے۔ اگر ہم اس خطبہ صدارت کا مطالعہ کریں جو اقبال نے آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس ۱۹۳۰ء میں پیش کیا تھا تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ اقبال کی نگاہ میں اخلاق کی کس قدر اہمیت تھی:

"یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ بحیثیت ایک اخلاقی نصب العین اور نظام سیاست کے (اس آخری لفظ سے میرا مطلب ایک ایسی جماعت ہے جس کا نظم و انضباط کسی نظام قانون کے ماتحت عمل میں آتا ہو۔ اور جس کے اندر ایک مخصوص اخلاقی روح سرگرم کار ہو) اسلام ہی وہ سب سے بڑا جزو ترکیبی تھا جس سے مسلمانان ہند کی تاریخ حیات متاثر ہوئی۔ اسلام ہی کی بدولت مسلمانوں کے سینے ان جذبات و عواطف سے معمور ہوئے جن پر جماعتوں کی زندگی کا دارومدار ہے اور جن سے منتشر و منتشر افراد بتدریج متحد ہو کر ایک متمیز و معین قوم کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور ان کے اندر ایک مخصوص اخلاقی شعور پیدا ہو جاتا ہے۔ . . . . . کیونکہ اسلامی تمدن کے اندر ایک مخصوص اخلاقی روح کارفرما ہے۔"[1]

لوتھر کی تحریک نے جس طرح حضرت عیسیٰ کے عالمگیر نظام اخلاق کو نقصان پہنچایا۔ اس کی طرف

---

(۱) حرف اقبال ص ۱۸

اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"خود لوتھر کو بھی اس امر کا احساس نہ تھا کہ جن مخصوص حالات کے ماتحت اس کی تحریک کا آغاز ہوا ہے اس کا نتیجہ بالآخر یہ ہوگا کہ مسیح (علیہ السلام) کے عالمگیر نظام اخلاق کی بجائے مغرب میں ہر طرف بے شمار اخلاقی نظام پیدا ہو جائیں گے جو خاص خاص قوموں سے متعلق ہوں گے۔ اور لہٰذا ان کا حلقۂ اثر بالکل محدود ہو جائے گا .... اس نے (لوتھر کی تحریک) مسیحی دنیا کی وحدت کو توڑ کر اسے ایک غیر مربوط اور منتشر کثرت میں تقسیم کر دیا جس سے اہل مغرب کی نگاہیں اس عالمگیر مطمح نظر سے ہٹ کر جو تمام نوع انسانی سے متعلق تھا، اقوام و ملل کی تنگ حدود میں الجھ گئیں"(۱)۔

"مسیح (علیہ السلام) کا عالمگیر نظام اخلاق نیست و نابود ہو چکا ہے اور اس کی جگہ اخلاقیات و سیاسیات کے قومی نظامات نے لے لی ہے۔ اس سے اہل مغرب بجا طور پر اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ مذہب کا معاملہ ہر فرد کی اپنی ذات تک محدود ہے۔ اسے دنیوی زندگی سے کوئی تعلق نہیں"(۲)۔

اقبال کے نزدیک اخلاق کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ وہ اخلاقی اقدار کو زندگی کے دوسرے شعبوں کی اقدار سے علاحدہ نہیں کرتے۔ وہ زندگی کو ایک وحدت مانتے ہیں۔ جیسے دنیا اور دین کے مختلف خانوں میں منقسم نہیں کیا جا سکتا۔ ان سے بھی زیادہ محدود شعبوں میں زندگی کو تقسیم کرنے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سرمایہ دارانہ ذہنیت کی دنیا سے انہیں سب سے بڑی شکایت یہ ہے کہ "اس میں اخلاقی اقدار اقتصادی مسائل سے الگ کی جا چکی ہیں"۔ اقبال انسان میں ایک خاص اخلاقی شعور پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ یہ اخلاقی شعور صرف انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی بھی ہے۔ اس اخلاقی شعور کو پیدا کرنا کوئی آسان بات نہیں۔ اس کے لیے انسان کو اپنی تمام زندگی نئی بنیادوں پر استوار کرنی پڑے گی۔

"اگر صحیح الدماغ انسانوں کا زبردست اجتماع موجود ہے اور ان کے دلوں میں جذبات کی گرمی ہے تو ان ہی کے اندر وہ اخلاقی شعور پیدا ہو جائے گا جسے ہم لفظ 'قوم' سے تعبیر کرتے ہیں۔ .... یہ ایک نہایت ہی طویل اور صبر آزما عمل ہے۔ اس لیے کہ اس کا مطلب انسان کی زندگی کو عملاً ایک نئے سانچے میں ڈھالنا ہے۔ اور اس کے جذبات و احساسات کی دنیا کو یکسر پلٹ

---

(۱) حرف اقبال ص ۱۹ (۲) حرف اقبال ص ۲۰

دینا ہے۔" اقبال کے خیال میں اس قسم کا شعور صرف اسلام ہی کے ذریعہ پیدا کیا جاسکتا ہے کیونکہ:

"اسلام محض انسان کی (انفرادی) اخلاقی اصلاح ہی کا داعی نہیں بلکہ عالم بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی مگر اساسی انقلاب بھی چاہتا ہے۔ جو اس کے قومی اور نسلی نقطۂ نگاہ کو یکسر بدل کر اس میں خالص انسانی ضمیر کی تخلیق کرے۔"

غرض ہم دیکھتے ہیں کہ اقبال نے انسانی زندگی میں اخلاق کی اہمیت واضح کی ہے۔ اس میں اخلاقی شعور پیدا کرنے کی کوشش کی اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اپنا نظریہ پیش کیا۔ نہ صرف اجمالاً بلکہ تفصیلاً۔ دوسرے نظریات کی طرح اقبال نے اپنا نظریۂ اخلاق بھی اسلام سے لیا۔ اور موجودہ زمانہ کے حالات کو سمجھ کر عصر حاضر کے مفکرین کے خیالات سے مستفید ہو کر اسے ایک نئے طریقہ سے باقاعدہ علمی اور فلسفیانہ طور پر پیش کیا۔

حکمائے قدیم کا فلسفۂ اخلاق

مصنفہ بشیر احمد ڈار

سچائی کسی قوم یا زمانے کی مخصوص ملکیت نہیں اور جدید دور میں جب ہم اپنے عصری تقاضوں کی روشنی میں حقائق تک پہنچنے کی کوشش کر رہے ہیں تو قدیم حکماء، فلاسفہ اور مصلحین کی کاوشوں کا مطالعہ تاریخی حیثیت سے بہت اہم ہو جاتا ہے۔

اس کتاب میں اسلام سے قبل کے کچھ حکماء اور مصلحین کا تقابلی مطالعہ اسی نقطۂ نگاہ سے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

صفحات ۵۰۸۔ قیمت ۶ روپے

ملنے کا پتہ:

سیکریٹری ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ۔ کلب روڈ۔ لاہور